© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد قسط:۲۸

ورق ورق زندگی

دیال سنگھ کالج میں چند روز:

نوکری کی تلاش میں ایک دن ''پاکستان ٹائمز'' میں پڑھا کہ دیال سنگھ کالج لاہور میں پولیٹیکل سائنس کے دو پروفیسروں کی ضرورت ہے۔ ایک فل ٹائم اور دوسرا پارٹ ٹائم۔ خواہش مند حضرات مقررہ تاریخ اور وقت دیال سنگھ کالج لائبریری میں انٹرویو کے لیے تشریف لے آئیں۔ چنانچہ میں بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ کئی دوسرے امیدوار تھے۔ انٹرویو ہو گیا تو انہوں نے مجھے پارٹ ٹائم لیکچرر کے لیے چُن لیا۔ جبکہ ایک دوسرے صاحب جو گارڈن کالج راولپنڈی میں تین چار سال تک پڑھانے کا تجربہ رکھتے تھے، اُنہیں فل ٹائم کے لیے رکھ لیا گیا۔ مجھے دن میں ایک لیکچر دینا تھا اور معاوضہ صرف ایک سو پچاس روپے تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ملازمت اس لحاظ سے درست رہے گی کہ لاہور میں رہ کر کسی بہتر نوکری کی تلاش آسان ہوگی۔ چنانچہ میں نے حامی بھرلی لیکن مسئلہ رہائش کا تھا کہ کہاں پر رہوں گا۔ چچا خضر تمیمی صاحب کے ہاں قیام کے لیے دل نہیں چاہ رہا تھا کہ پہلے ہی دو سال تک اُنہیں تکلیف دی تھی اور دوسری کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اب دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا سبب بنایا کہ دیال سنگھ کالج لائبریری سے باہر نکلا تو چنیوٹ کے ایک پرانے دوست شیخ امتیاز سے ملاقات ہو گئی۔ شیخ امتیاز غیر معمولی حد تک بذلہ سنج اور ذہین آدمی تھے۔ بلا کی حسِ مزاح تھی۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی غم زدہ نہیں رہتا تھا۔ بڑی مدت کے بعد ملے تو خوب ملے۔ ہم دونوں کافی دیر تک بغل گیر رہے، انتہائی مسرت اور خوشی کا اظہار دونوں طرف سے ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تم لاہور میں کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگے کہ ایک معمولی کاروبار کا آغاز کیا ہے دیکھیں کب تک معاملہ درست ہوتا ہے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے اپنی کہانی کہہ سنائی، ٹھہرنے اور قیام کرنے کی جگہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا ابھی آج ہی انٹرویو ہوا ہے۔ کل سے پڑھانا شروع کرنا ہے۔ رہائش کا ابھی کوئی انتظام نہیں سوچا۔ کہنے لگے کہ چلو پھر اکٹھے رہیں گے، میں نے کہا کہ تمہارے ساتھ رہنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انتہائی خوش وخرم رہیں گے کہ تمہیں تو غم غلط کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ ایسی ایسی باتیں کرتے ہو کہ خوامخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے، روتے ہوئے کو ہنسا لینا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کہنے لگا کہ رہائش ہی ایسی رکھی ہے کہ وہاں پر خوش رہے بغیر سرے سے رہنا ہی مشکل ہوگا۔ شاید گوالمنڈی کے قریب کئی کمروں کی ایک بلڈنگ تھی، جس میں ایک کمرہ انہوں نے لے رکھا تھا۔ سامان کے نام پر زمین پر چند بوریاں بچھی تھیں اور بڑی بے سروسامانی کا منظر تھا۔ ایک دفعہ تو میں پریشان ہو گیا لیکن پھر سنبھل گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیت الخلا اور غسل خانے جانے کے لیے باقاعدہ قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ بہرحال دوست انتہائی ہنس مکھ اور کسی بھی مشکل کو مشکل نہ سمجھنے والا تھا۔ میں ایک پیریڈ پڑھا کر اور وہ اپنے ابتدائی کاروبار سے فارغ ہو کر واپس اکٹھے ہوتے۔ یومیہ ہم پچھلے ٹائم سیر کو نکلتے اور رات گئے آ کر زمین پر سو رہتے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ میری کالج کے ہیڈ کلرک سے لڑائی ہو گئی، وہ انتہائی بدتمیز قسم کا آدمی تھا۔ میں نے بھی جوابی کارروائی کی تو اردگرد کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ معاملہ پرنسپل صاحب تک میں خود لے گیا لیکن پرنسپل صاحب موجودہ دور کے جمہوری حکمرانوں کے آر کی ٹائپ تھے۔ انتہائی غیر فعال اور بے اختیار۔ انہوں نے میری فریاد پر کان ہی نہ دھرے تو میں انتہائی مایوس ہوا۔ کالج نظم و نسق کے اعتبار سے بھی خاصا بے ہنگم سا تھا۔ لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی اور جگہ کم۔ ایک عجیب قسم کا ماحول تھا کہ میں جس میں بس حیران و پریشان ہی رہتا۔ صرف اس انتظار میں تھا کہ کوئی بہتر نوکری ملے تو یہاں سے جان چھوٹے۔ رحمت باری نے ہمیشہ کی طرح دست گیری کی۔ ان حالات میں دس پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ میں نے شیخ امتیاز سے کہا کہ چلو یار آج مزنگ روڈ پر چچا خضر تمیمی صاحب کو سلام کر آئیں۔ اس نے کہا ہمیں تو سیر کو ہی جانا ہے کہیں اور نہیں تو ادھر کو چل پڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مزنگ روڈ پر چچا جان کو ملنے چلے گئے۔ چچا جان مجھے دیکھتے ہی بولے:

”تم آج کل کدھر ہوتے ہو؟ تمہارا ایک دوست نام تو بھول گیا ہوں آج یہاں میرے پاس آیا تھا اور تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ تو آج کل شاید لاہور میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ تمہارے لیے اس پیغام دیا ہے کہ اسلامیہ کالج خانیوال میں نوکری کا انتظام ہو گیا ہے، اگر ارادہ ہو تو رات والی گاڑی کے لیے مجھے ریلوے سٹیشن پہ مل لو اور اگر وہاں میں اسے نہ مل پاؤں تو پھر سیدھا اسلامیہ کالج خانیوال میں پہنچ جاؤ۔ میں اسے وہاں ملوں گا۔ اس نے مزید کہا کہ وہ اسلامیہ کالج میں پڑھا رہا تھا کہ اُسے سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ اور پرنسپل نے کہا ہے کہ اپنی جگہ کوئی آدمی دے کر جاؤ اور یہ بات اُس کے علم میں ہے کہ ابھی تک خالد شبیر کو کوئی نوکری نہیں ملی۔ اس لیے میں اس کی تلاش میں آپ کو ملنے آیا ہوں۔“

میں نے چچا جان سے اس کا چہرہ مہرہ پوچھا تو مجھے سمجھ آ گئی کہ کون آیا تھا اور کیا معاملہ ہے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھٹی صاحب ہیں اور راولپنڈی سے اُن کا تعلق ہے۔ بہرحال ہم چچا خضر تمیمی صاحب کے دفتر سے باہر آئے تو شیخ امتیاز نے کہا کہ یار کیا تیری قسمت ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے تیری نوکری کا انتظام ہو گیا ہے۔ تیرے تو فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی اور ہم تو ویسے ہی خضر صاحب کو ملنے آ گئے تھے یہاں تو خوب ہی معاملہ نکلا۔ اب جلدی سٹیشن جانے کی تیاری کرو، رات کے وقت گاڑی کی روانگی تھی۔ ہم آرام سے اپنی جگہ پر آئے سامان اٹھایا، کسی ہوٹل سے روٹی کھائی اور ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے ریلوے سٹیشن پر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بھٹی صاحب مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ امتیاز شیخ نے ٹکٹ لے لیا اور گاڑی جب روانہ ہونے والے تھی تو ایک ڈبے میں مجھے بھی سیٹ مل گئی اور میں خانیوال کے لیے روانہ ہو گیا۔ امتیاز شیخ نے مجھے دعاؤں کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رخصت کیا۔اس طرح دیال سنگھ کالج کے اوبڑکھابڑ ماحول سے جان چھٹی صرف پندرہ یا بیس دن تک وہاں پڑھایا۔تنخواہ کیسی اور استعفیٰ کیا۔گاڑی چل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب سبب بنایا ہے۔لیکن بار بار بھٹی صاحب کا بھی خیال آتا تھا کہ وہ نہیں ملے اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل صاحب سے تو میرا تعارف انہوں نے کرانا ہے۔اسی سوچ میں تھا کہ گاڑی ساہیوال ریلوے سٹیشن پر رکی، میں چائے کا کپ پینے کے لیے سٹال پر اُترا تو بھٹی صاحب مجھ سے پہلے سٹال پر کھڑے تھے۔ ملے اور میں نے اُن سے کہا کہ یہ کیسے ہوا، کہنے لگے کہ مجھے سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ پرنسپل صاحب میاں عبدالباری نے کہا کہ اپنی جگہ پڑھانے کے لیے آدمی دے جاؤ اور چلے جاؤ۔وہ یہ چاہتے ہیں کہ لڑکوں کا کوئی نقصان نہ ہو۔ ایک آدمی اگر جارہا ہے تو دوسرا آدمی آجائے تاکہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہے۔

دیال سنگھ کالج سے اسلامیہ کالج خانیوال:

صبح سویرے ہم دونوں (میں اور میرا کلاس فیلو جن کا نام میں بھول چکا ہوں) بھٹی صاحب اسلامیہ کالج میں تھے۔ انہوں نے میری پرنسپل صاحب سے ملاقات کرائی اور کمال یہ ہے کہ پرنسپل صاحب نے مجھے صرف یہ کہا کہ دیکھو ہم نے تمہیں سِوکس کے لیے کالج میں رکھ لیا ہے اور تم ابھی کلاس میں جا کر پڑھانا شروع کردو، یہ تمہارا ٹائم ٹیبل ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ نہ کوئی انٹرویو نہ یہ پوچھا کہ تم نے ایم۔اے کیا ہوا بھی ہے کہ نہیں۔اور پڑھانے کے لیے کہا جارہا ہے۔ بہرحال میں نے کام شروع کردیا اور بھٹی صاحب کالج سے باقاعدہ فارغ ہو کے راولپنڈی کسی کالج کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب کالج میں چھٹی ہوئی تو پرنسپل صاحب میاں عبدالباری نے مجھے بلایا اور کہا کہ تمہاری رہائش کا کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ سر میرا تو یہاں پر ایسا کوئی ٹھکانہ نہیں جہاں پر رہائش اختیار کی جائے۔ کہنے لگے یہاں پر چند پروفیسروں نے اپنا ایک مکان لے رکھا ہے اور کھانا پکانے کے لیے ایک باورچی بھی اُن کے پاس ہے اُن کو کہے دیتا ہوں وہیں رہائش اختیار کرلو۔ چنانچہ ایک پروفیسر کو بلوایا اور اُنہیں کہا کہ یہ تمہارے ساتھی ہیں اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔اس طرح خانیوال میں میری رہائش کا انتظام بھی ہوگیا۔

پرنسپل میاں عبدالباری:

پرنسپل صاحب اُن لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔جن کا میری زندگی میں بہت اثر رہا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کم ہی کسی سے متاثر ہوتا ہوں لیکن میاں عبدالباری اپنی خوبیوں کی وجہ سے ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنہیں میں مرتے دم تک نہیں بھول پاؤں گا۔ سرکاری ملازمت کی۔ میانوالی میں بطور پرنسپل کام کررہے تھے تو ریٹائرڈ ہوگئے۔ یہاں اسلامیہ کالج قائم ہوا تو انہیں بطور پرنسپل بلالیا گیا۔ دراز قامت، باریش اور مضبوط جسم کے آدمی تھے۔مختصر بات کرتے تھے۔انہیں ہر ایک کو اپنے دائرے میں رکھنے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ دل کے صاف اور زبان کے میٹھے۔بس جی چاہتا کہ انہیں سنا ہی جائے۔انتہائی متین اور سنجیدہ۔خود پڑھاتے بھی تھے اور لڑکوں کو سزا بھی دیتے تھے غالباً ریاضی کے استاد تھے۔نظم ونسق پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت زیادہ توجہ دیتے اس لیے کالج اچھی شہرت حاصل کر گیا تھا۔ تعداد بھی خاصی تھی۔ بہر حال میرا جی لگ گیا اور ماحول ایسا تھا کہ میں اسے ہر لحاظ سے اپنی مرضی کے مطابق کہہ سکتا ہوں۔ میں جس مکان میں پروفیسروں کے ساتھ رہائش پذیر ہوا وہ بھی انتہائی عمدہ مزاج بلکہ میرے ہم مزاج تھے۔ جلد ہی اُن میں گھل مل گیا جیسے برسوں سے اکٹھے رہ رہے ہوں۔ تمام اساتذہ پرنسپل صاحب کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ اساتذہ ہی نہیں طلبا کے دلوں میں بھی پرنسپل میاں عبدالباری کا بڑا احترام تھا اور اس کے ساتھ رعب و دبدبہ بھی۔ ایک دن کالج میں لڑکوں نے ہڑتال کر دی۔ اساتذہ ناکام ہوئے تو میاں عبدالباری صاحب اپنے دفتر سے باہر برآمدے میں آئے اور طلباء جو کالج کے دروازے پر جمع تھے انہیں کہا کہ پانچ منٹوں کے اندر اندر تمام طلباء کو کمروں میں ہونا چاہیے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکے یوں کمروں کی طرف بھاگے جیسے پولیس اُن پہ لاٹھی چارج کر رہی ہے۔

میری گستاخی پر اُن کا ردِّ عمل:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم خانیوال سے باہر والے اساتذہ کے خیال میں کالج میں دو چھٹیاں ہونی چاہیے تھیں جبکہ پرنسپل صاحب کے خیال کے مطابق ایک چھٹی تھی۔ ہم ہمت کر کے اُن کے دفتر گئے۔ قیادت میں ہی کر رہا تھا۔ وہ دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر سے ہمیں بتا رہے تھے کہ نہیں بھائی تمہاری ایک ہی چھٹی بنتی ہے۔ ہم دو اس لیے چاہتے تھے کہ ایک دن گھر رہ کر آ جائیں گے۔ میں اُن کے جواب پر مایوس سا ہوا تو جذباتی سا ہو کر اُنہیں یہ کہہ دیا کہ ”اچھا پھر ایک بھی نہ دیں۔“ میرا لہجہ بھی درست نہیں تھا۔ مجھے انہوں نے دیکھا اور بڑے آرام سے ایک فقرہ کہا کہ:

Mr. Shabbir you should keep it in your mind that you are talking to your principal.

(مسٹر شبیر تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ تم اپنے پرنسپل سے بات کر رہے ہو۔)

بس پھر کیا تھا میں تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ مجھے فوراً احساس ہوا، میرا فقرہ اہانت آمیز تھا اور پرنسپل صاحب جن کا میرے دل میں حقیقی احترام تھا، مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ یہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ دفتر سے باہر نکلتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو بھی اُتر آئے کہ یہ کیا ہوا، اتنا اچھا آدمی مجھ سے ناراض ہو گیا۔ کاش میں وہ نہ کہتا جو انہیں اچھا نہیں لگا۔ آ کر سٹاف روم میں بیٹھ گیا لیکن بے چین رہا کہ کب وہ اکیلے اپنے کمرے میں ہوں میں اُن سے معافی مانگو۔ چنانچہ وہ اکیلے ہوئے میں دفتر گیا اور میں نے انتہائی عاجزی سے کہا کہ سر میری گستاخی کو معاف فرمائیں تا کہ مجھے چین آئے۔ میں انتہائی افسردہ ہوں کہ میں نے آپ کو کیا کہہ دیا۔ میرے چہرے کے تاثرات ان پر واضح تھے۔ وہ کرسی سے اُٹھے انہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور کہا نہیں بیٹے ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے بس ہو گیا جو ہو گیا، یقین کرو کہ میرا دل تمہارے لیے بالکل ویسا ہی ہے

© rasailojaraid.com

جیسے اس فقرے سے پہلے تھا، میں تمہارے کام سے انتہائی خوش ہوں، بس کام کرتے رہو اور میرے بارے میں کبھی خیال نہ کرنا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ میں خوش ہو گیا جیسے مجھے کوئی قیمتی چیز جو گم ہو گئی ہو دوبارہ مل جائے۔

علامہ خالد محمود صاحب جو بعد میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے پورے ملک میں مشہور ہوئے اور جنہوں نے بطور مناظر و متکلم بڑا نام کمایا، شریعت کورٹ کے جج کی حیثیت سے بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ اسی کالج میں میرے کولیگ تھے لیکن اُن سے بہت زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ جہاں میں رہائش پذیر تھا وہ تمام پروفیسر (چند نام یاد رہے گئے ہیں: حفیظ الرحمٰن حفیظ، خان صاحب، صفدر صاحب، علامہ فضل احمد عارف اور زبیر صاحب پچھلے ٹائم کلب جاتے تھے اور میں اکیلا گھر پر بور ہوتا رہتا تھا۔ انہوں نے مجھے کلب کا ممبر بننے کے لیے کہا، چنانچہ میں کلب کا ممبر تو بن گیا لیکن میرے ذہن میں یہ بات سوار ہو گئی کہ کلب کا لفظ اپنے سامراجی و استعماری پس منظر، دیسی انگریزوں اور کالے صاحبوں والی شناخت کی وجہ سے ہمارے خاندان میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ کہیں والد محترم میرے کلب کے رکن بننے پر ناراض نہ ہو جائیں۔ چنانچہ خط کے ذریعے اُنہیں اس بات سے آگاہ کر دیا۔ جواب آیا:

”مجھے تمہارے کلب کے رکن بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہاں پر حکومت کے بڑے افسران براجمان ہوتے ہیں جو بڑے دھڑلّے سے دین کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں دین کے دفاع میں کسی قسم کی کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیشہ دین کی بات کو بے درنگ کہنے کی عادت اپنائے رکھنا۔“

میں نے تا بمقدور زندگی بھر ان کی اس نصیحت پر عمل کر کے دکھایا۔ جہاں بھی رہا میرا حلقۂ احباب اس بات کا گواہ رہا کہ خالد شبیر دین کے دفاع میں بڑی دلیری سے کام لیتا ہے۔ اسے کوئی فکر نہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا ہوگا۔

جب میں ہر طرح سے کالج میں، میں ایڈجسٹ ہو گیا تو میں نے مکان کرائے پر لے لیا اور گھر والوں کو بھی وہاں بلا لیا اور بڑے لطف سے زندگی گزرنے لگی۔ یہ سن ۱۹۶۱ء کی بات ہے جبکہ میں خانیوال اسلامیہ کالج میں لیکچرر تھا۔